اُنیسویں صدی کے ہندوستان کی ہیئت شرعی

(شاہ عبدالعزیزؒ کے فتاوائے دارالحرب کا ایک علمی تجزیہ)

ڈاکٹر مشیر الحق ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی (میکگل)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آخر اٹھارہویں صدی تک ہندوستان کے مغل حکمراں اپنی اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود اس ملک کے شہنشاہ سمجھے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے کم سے کم ہندوستانی مسلمانوں کی نظر میں یہ ملک اصولی طور پر دارالاسلام کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن ۱۸۰۳ء میں دلی پر انگریزوں کا سیاسی تسلط ہو جانے کے بعد صورت حال میں تبدیلی آگئی۔ اور لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونے لگا کہ دارالسلطنت پر انگریزوں کا سیاسی اقتدار قائم ہو جانے کے بعد بھی ہندوستان کو دارالاسلام ہی سمجھا جائے یا اسے دارالحرب کہا جائے۔ یہ سوال ذہنوں میں آیا ہی کیوں اور اس سوال کے پوچھنے کا مقصد کیا تھا۔ اس پر ہم آئندہ صفحات میں بحث کریں گے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب شاہ عبدالعزیزؒ (۱۱۵۹ = ۱۷۴۶ / ۱۲۳۹ = ۱۸۲۳) سے ہندوستان کی ہیئت شرعی کے بارے میں سوالات کئے گئے تو انہوں نے ہندوستان کو دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا۔

شاہ صاحب کے فتویٰ دینے کے تقریباً سو سال کے اندر اندر ہندوستان کی سیاسی صورت میں نمایاں تبدیلیاں آگئیں۔ وہی ہندوستانی جنہوں نے ۱۹ ویں صدی میں انگریزوں کو بجبر یا برضا اس ملک کا مطلق العنان حاکم تسلیم کر لیا تھا بیسویں صدی میں آزادی کی

خاطر ہر قسم کی قربانیاں دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ آزادی کی اس جنگ میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ درحقیقت یہ جنگ تھی ملکی اور غیر ملکی کے درمیان۔ انگریز غیر ملکی تھے انہیں ملک بدر کرنے کے لئے ہر ملکی کو، خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو۔ متحد ہونا تھا۔ نہ صرف یہ کہ انہیں متحد ہونا تھا بلکہ جنگ آزادی کی فوج میں نئے سپاہیوں کو بھرتی کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ لیڈر عوام میں یہ احساس پیدا کریں کہ ان کی انگریز دشمنی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کے وقت ہی سے ان کے بزرگ انگریز دشمن رہے ہیں۔ مسلمانوں میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان علماء نے جو جنگ آزادی میں پیش پیش تھے۔ شاہ صاحب کے فتوائے دار الحرب سے کام لیا۔ عام طریقہ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک دار الاسلام جب دار الحرب ہو جاتا ہے تو وہاں کے مسلمانوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اس ملک کو پھر سے دار الاسلام بنانے کے لئے اپنی ہر ممکنہ قوت استعمال کریں۔ اور اگر پوری کوشش کے باوجود انہیں کامیابی نہ ہو تو پھر ایسے ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ اس پس منظر میں جب شاہ صاحب کے فتویٰ کی اشاعت کی گئی تو اس کا لازمی نتیجہ لوگوں نے یہی نکالا کہ انہیں ہندوستان کی آزادی کی خاطر انگریزوں سے جنگ کرنی ہے اور اگر اس جنگ میں انہیں شکست ہو تو پھر ملک سے ہجرت کر جانا ضروری ہے کیوں کہ ان کے بزرگ شروع سے یہی کرتے (یا کہتے) آئے ہیں۔

۲۰ ویں صدی کا ابتدائی حصہ ہندوستان میں سیاسی حیثیت سے تاریخ کی حسب منشا تعبیر و تشریح کے لئے بہت مناسب تھا۔ اس لئے جب کہنے والوں نے یہ کہا کہ شاہ صاحب نے اپنے فتویٰ کے رو سے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہ ضروری قرار دیا تھا کہ وہ یا تو انگریزوں سے جنگ کریں یا بدرجۂ مجبوری اس ملک سے ہجرت کر جائیں، تو کسی کو بھی اس میں کوئی عجوبہ نظر نہ آیا۔ کسی نے بھی یہ سوچنے کی اتنی زحمت گوارا نہ کی کہ اس تشریح و تعبیر میں حقیقت کا شائبہ کہاں تک ہے۔ اس وقت چونکہ ہندوستان میں انگریز دشمنی کا رجحان عام تھا۔ اس لئے کسی نے

بھی یہ سوال نہیں کیا کہ اگر شاہ صاحب نے جہاد یا ہجرت کا حکم دیا تھا تو پھر ان کی زندگی میں لوگوں نے اس پر عمل کیوں نہیں کیا۔ اور اگر اس فتوئی پر عمل کرنا مقصود نہ تھا۔ تو پھر لوگ خواہ نخواہ یہ سوال پوچھ ہی کیوں رہے تھے۔ اس کے برعکس دارالحرب میں فریضۂ جہاد و ہجرت کے مسئلہ پر بار بار زور دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شخص تسلیم کرنے لگا کہ کسی ملک کے دارالحرب ہو جانے کا مطلب ہی یہی ہے کہ مسلمان یا تو جہاد کریں یا ہجرت، اب اگر کسی زمانے یا کسی ملک کے مسلمان اپنے اس فریضے کو ادا نہیں کرتے تو یہ ان کی اپنی کوتاہی ہے، ان کی اپنی بے عملی، شریعت کے عائد کردہ فریضہ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتی۔ کہا جا سکتا ہے کہ شریعت کے احکام کو ناپنے کا پیمانہ مسلمانوں کا عمل یا ان کی بے عملی نہیں ہے۔ لیکن اس مفروضہ ہی میں کہاں تک حقیقت ہے کہ شاہ صاحب نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر مسلمانوں پر جہاد یا ہجرت کا فریضہ عائد کیا تھا۔

جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ شاہ صاحب نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیکر مسلمانانِ ہند پر جہاد یا ہجرت کا فریضہ عائد کیا تھا۔ وہ بھی کھل کر یہ بات نہیں کہتے کہ شاہ صاحب نے واضح الفاظ میں جہاد یا ہجرت کا حکم دیا تھا۔ بلکہ درحقیقت یہ مطلب وہ فتوئی کے بین السطور سے نکالتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سیاسی صورت حال کے باعث شاہ صاحب کھل کر نہ تو جہاد کا حکم دے سکتے تھے اور نہ ہجرت کی تبلیغ کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ایک شرعی اصطلاح کا سہارا لے کر اپنے مافی الضمیر کو لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ ذاتی پسندیدگی اور سیاسی مصلحتوں سے بلند ہو کر اگر ہم اس مسئلہ پر نظر ڈالیں تو اس تشریح کی حیثیت ایک علمی مغالطے سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ سب سے پہلے تو ہمیں فتوئی اور سیاسی بیان کے فرق کو ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ ایک سیاسی لیڈر جب کوئی بیان جاری کرتا ہے۔ (خواہ وہ فتوئی ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو) اس کے پیش نظر وقت کی سیاسی مصلحت ہوتی ہے۔ سیاسی لیڈر اس بات کا انتظار نہیں کرتا کہ لوگ اس سے سوال کریں پھر وہ کوئی بیان دے۔ بلکہ صورت حال کا مطالعہ کر کے

خود ہی اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے برعکس ایک مفتی اس وقت فتویٰ دیتا ہے جب اس کے سامنے کسی متعین مسئلہ کو پیش کرکے اس سے شریعت کا حکم معلوم کیا جاتا ہے۔[1] چوں کہ اس دوسری قسم میں مجیب کے علاوہ سائل بھی ایک اہم کردار ہوتا ہے اس لیے اگر ہمیں کسی فتویٰ میں سوال کی غرض و غایت کا پتہ چل جائے تو پھر فتویٰ کے بین السطوری مفہوم کی اہمیت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

دارالحرب کے سلسلے میں ایک بہت ہی اہم بات جو عام طور پر نظرانداز کردی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک دارالاسلام، دارالحرب میں تبدیل ہوجانے کے بعد وہاں کی مسلمان آبادی پر صرف "فرائض" ہی عائد نہیں کرتا۔ بلکہ انہیں چند ایسے حقوق بھی عطا کرتا ہے جو اس سے قبل مسلمانوں کو دارالاسلام میں حاصل نہیں تھے۔ مثلاً دار کی تبدیلی اگر مسلمانوں پر یہ فرض عائد کرتی ہے کہ وہ دارالحرب کو دوبارہ دارالاسلام میں تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ تو دوسری طرف انہیں یہ حق بھی عطا کرتی ہے کہ وہ غیر مسلموں سے سودی لین دین کرسکیں جس کی انہیں پہلے اجازت نہیں تھی۔ اس کلیہ کو ذہن میں رکھ کر جب ہم شاہ صاحب کے ان تمام فتووں کا مطالعہ کرتے ہیں جو ہندوستان کی ہیئت شرعی کے متعلق ہیں، تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اس وقت جن لوگوں کو بھی دارالحرب کے مسئلے سے دلچسپی تھی انہیں اپنے "فرض" سے زیادہ اپنے "حق" کی فکر تھی۔

مجموعہ[2] فتاویٰ عزیزی میں ہندوستان کی ہیئت شرعی سے متعلق ہمیں کئی ایک فتاویٰ ملتے ہیں۔ سب سے پہلا فتویٰ اس اصولی اور علمی سوال کے جواب میں ہے کہ ایک دارالاسلام کبھی دارالحرب میں تبدیل ہوسکتا ہے یا نہیں۔ اس سوال کے جواب میں شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حسب ذیل باتیں دارالاسلام کو دارالحرب میں تبدیل کردیتی ہیں۔

۱۔ دارالاسلام میں غیر مسلموں کے احکام کا جاری ہوجانا۔

۲۔ قبضہ کرنے والے دارالحرب اور مقبوضہ دارالاسلام کے درمیان کسی دوسرے دارالاسلام

کا واقع نہ ہونا۔

۳۔ امان اول کا ختم ہو جانا۔

اگر ان تینوں شرطوں کو ضروری سمجھا جائے تو پھر شاہ صاحب کے زمانے میں ہندوستان کو دارالحرب کہنا ممکن نہ تھا۔ کیوں کہ ہندوستان اور انگلینڈ کے درمیان ایک دوسرا دارالاسلام (خلافتِ عثمانیہ) کا وجود تھا۔ شاید اسی دشواری کے پیش نظر شاہ صاحب نے دارالحرب کی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ درحقیقت دارالاسلام وہ ملک ہے جہاں امام المسلمین کے احکام جاری و ساری ہوں۔ اور دارالحرب وہ ملک ہے جہاں حربیوں (غیر مسلموں) کے احکام چلتے ہوں۔ اس تشریح کے مطابق ہندوستان دارالحرب تھا۔ کیوں کہ اس وقت کے ہندوستان پر مغلوں کی نام نہاد حکومت کے باوجود سکہ انگریزوں کا چلتا تھا، جیسا کہ اسی فتویٰ میں مذکور ہے:

" اس شہر (دہلی) میں امام المسلمین کے بجائے عیسائی حکام کا اقتدار ہے۔ اقتدار کا مطلب یہ ہے کہ امور مملکت، ٹیکسوں کی وصولیابی، مجرموں کی سزائیں مقدمات کے فیصلے، سب کچھ ان کی مرضی سے طے کئے جاتے ہیں۔ ہاں چند اسلامی شعائر ایسے ہیں جن سے وہ تعارض نہیں کرتے۔ مثلاً جمعہ و عیدین کی نمازیں، اذان اور قربانی وغیرہ لیکن یہ آزادی مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ عیسائیوں کی سیاسی مصلحت کی بنا پر ہے۔ کیوں کہ یہ لوگ مساجد کو بے تکلف منہدم کر دیتے ہیں اور ان کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں ہے۔ ان کا دبدبہ اس قدر ہے کہ انکی اجازت کے بغیر کوئی بھی مسلمان یا ذمی اس شہر بلکہ اس شہر کے مضافات میں بھی داخل نہیں ہو سکتا۔ تاجروں اور اس قسم کے بے ضرر مسافروں کی آمد و رفت پر انہوں نے کوئی پابندی عائد نہیں کی ہے۔ کیونکہ اس میں خود انہیں کا فائدہ ہے۔ لیکن سیاسی حیثیت سے معروف لوگ مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم[۴] اس شہر میں ان کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتے۔ اس شہر سے لے کر کلکتہ تک عیسائیوں کی

حکومت ہے۔ دائیں بائیں اور درمیان کی چند ریاستوں مثلاً لکھنؤ، رام پور اور حیدرآباد میں انہوں نے اپنے احکامات جاری نہیں کئے ہیں۔ کیوں کہ یہاں کے نوابوں نے ان سے معاہدے کر رکھے ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر ہندوستان کو دارالحرب ہی کہنا پڑے گا۔ جیسا کہ ہمیں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بنی یربوع کے علاقہ کو دارالحرب قرار دے کر مانعین زکوٰۃ سے جہاد کیا تھا۔ حالاں کہ وہاں اذان و نماز سب جاری تھیں ...۔"(۵)

مذکورہ بالا سوال وجواب سے اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ شاہ صاحب نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا لیکن استفتا اتنا مختصر ہے کہ اس سے ہمیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ پوچھنے والے نے یہ سوال اٹھایا ہی کیوں تھا۔ سوال صرف اتنا تھا کہ ایک دارالاسلام کبھی دارالحرب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کا جواب اصول فتویٰ نویسی کے مطابق ہاں یا نہیں میں ہونا چاہئے تھا ہندوستان کی تفصیلی صورت حال کا تذکرہ مذکورہ بالا استفتا کے جواب میں غیر ضروری معلوم ہوتا ہے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ یا تو مرتبین فتاویٰ کو سوال کا پورا متن نہیں ملا یا پھر جواب کا مذکورہ بالا ٹکڑا کسی دوسرے سوال کے جواب کا ہے۔ جسے مرتبین نے غلطی سے اس جگہ لگا دیا ہے(۶)۔ بہرحال اس سے قطع نظر کہ مذکورہ بالا ٹکڑا اسی سوال کے جواب کا حصہ ہے یا نہیں، یہ بات بلاشبہ طے ہو جاتی ہے کہ ہندوستان شاہ صاحب کی نظر میں دارالحرب تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو ہندوستان کے دارالحرب یا دارالاسلام ہونے کی فکر تھی، انہوں نے یہ سوال اٹھایا ہی کیوں تھا اور پھر یہ جان لینے کے بعد کہ ہندوستان دارالحرب ہے انہوں نے اگلا قدم کیا اٹھایا، اس سوال کا جواب جب تک ہمیں واضح طور پر نہ مل جائے اس وقت تک ہماری یہ بحث نامکمل رہتی ہے کہ شاہ صاحب نے ہندوستان کو دارالحرب کیوں قرار دیا تھا۔ "فتاوائے عزیزی" میں ہمیں مختلف جگہوں پر دارالحرب اور اس سے پیدا ہونے والے مختلف مسائل سے متعلق چند اور بھی سوال وجواب ملتے ہیں۔ جسے عام طور سے آج کل مورخین نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جب

تک ہم ان تمام فتاویٰ کا ان کے سیاق و سباق کے ساتھ مطالعہ نہ کرلیں۔ کسی نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہے۔

اس سلسلے کا دوسرا سوال جو ہمیں فتاویٰ عزیزی میں ملتا ہے، وہ دارالحرب میں حربی غیر مسلموں کو سود دینے سے متعلق ہے۔ شاہ صاحب کا جواب سننے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی معاشی حالت اس درجہ کو پہنچ چکی تھی کہ وہ اپنی غیر ضروری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے سود پر عام طور سے قرض لیا کرتے تھے۔ اس زمانے کی سماجی تاریخوں کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سود کے شکنجے میں نہ صرف عوام بلکہ بڑے بڑے امراء حد یہ ہے کہ خود بادشاہ بھی جکڑے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ سودی قرض لینے والے مسلمانوں میں کچھ ایسے لوگ بھی رہے ہوں گے جو سودی لین دین کو حرام سمجھنے کے باوجود مجبوراً سود پر قرض لیتے رہے ہوں گے اور انہیں اس کی فکر بھی رہی ہو گی کہ کسی صورت سے ان کا یہ فعل 'گناہ' کے زمرے سے نکل جائے۔ اس گناہ سے بچنے کی سب سے بہترین صورت تو یہ تھی کہ وہ ہر قسم کی تکالیف برداشت کرتے مگر سود پر قرض نہ لیتے۔ لیکن یہ آسان کام نہ تھا۔ زندگی میں ایسے بے شمار نمائشی مواقع آتے ہیں۔ جب عوام و خواص کی اکثریت آخرت کی جوابدہی کے مقابلے میں ہم چشموں کے طنز و تعریض کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ سود پر روپیہ قرض لے کر سماجی اور رواجی تقریبات میں اپنے کو دوسروں سے برتر ثابت کرنا انہیں مواقع میں سے ایک ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسی شرعی صورت نکل آتی ہے جس کی رو سے کوئی گناہ از روئے شرع گناہ کے زمرے سے نکل جاتا ہے۔ تو پھر ہم خرما و ہم ثواب کے پیش نظر کون اس سے واقفیت حاصل کرنا نہیں چاہے گا سودی لین دین سے متعلق جو سوال اوپر نقل کیا گیا ہے وہ اس ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ شاہ صاحب اس نکتہ کو نہ سمجھ رہے ہوں گے۔ لیکن وہ ایک مفتی کی حیثیت سے اس بات پر مجبور تھے کہ سوال کا وہی جواب دیں جو فقہہ کی کتابوں میں مذکور ہو۔ خواہ اس کے اثرات سوسائٹی پر کیسے ہی پڑتے ہوں۔ چوں کہ شریعت میں سود لینے اور دینے میں کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے شاہ صاحب نے صرف 'سود دینے' کے مسئلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اصولی بحث

شروع کی اور کہا کہ کتب فقہہ کی رو سے سود دینے اور سود لینے کا حکم یکساں ہے۔ شریعت نے دونوں کو منع کیا ہے۔ لیکن اس ممانعت کا اطلاق دارالحرب میں رہنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان باہمی سودی لین دین پر نہیں ہوگا ... واضح رہے کہ حربیوں سے دارالحرب میں سود لینا تو اس وجہ سے جائز ہے کہ ان کا مال مسلمانوں کے لئے مباح ہے بشرطیکہ مال کا حصول کسی بدعہدی یا بے ایمانی کے ذریعہ نہ ہو۔ سودی لین دین میں ایک حربی چونکہ اپنی مرضی سے خوشی خوشی سود ادا کرتا ہے اس وجہ سے اس کا لینا مسلمانوں کے لئے بالکل جائز ہے دوسری طرف حربیوں کو سود دینا اس وجہ سے جائز ہے کہ سود کی حیثیت مال حرام کی سی ہے۔ اور چونکہ حربی مسلمانوں کے برخلاف، حرام چیزیں کھاتے ہیں اس لئے اگر انہیں سود دیا جائے تو اسکی حیثیت اس سے زیادہ کچھ اور نہیں ہوگی کہ انہیں مال حرام کھلایا گیا۔ اور یہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ حکم دارالاسلام میں رہنے والے غیر مسلموں کے لئے نہیں ہے۔ ایسے غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان سودی لین دین ناجائز ہے۔ کیوں کہ اس طرح دارالاسلام میں سودی کاروبار ترویج پا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی اضطراری حالت پیدا ہو جائے تو ایک مسلمان دارالاسلام میں بھی بحالت مجبوری کسی غیر مسلم سے سودی قرض لے سکتا ہے۔ (۷)

مذکورہ بالا جواب اس بات پر خاصی روشنی ڈالتا ہے کہ ۱۹ ویں صدی کے مسلمان ہندوستان کی ہیئت شرعی کو معلوم کرنے کے لئے بے چین کیوں تھے۔ بایں ہمہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا سوال ایک مسئلہ کی علمی تشریح و تعبیر سے متعلق تھا اور اس کا تعلق ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے عمل سے نہیں تھا۔ مگر یہ مفروضہ اس وقت ختم ہو جاتا ہے، جب ہم اگلے سوال و جواب پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس استفتا میں حسب ذیل سوالات پوچھے گئے تھے۔

۱۔ ہندوستان کے وہ علاقے جو عیسائیوں کے قبضہ میں ہیں دارالحرب ہیں یا دارالاسلام؟ اگر یہ علاقے دارالحرب ہیں تو کیا یہاں کے مسلمان عیسائیوں سے سود لے سکتے ہیں؟

۲۔ کیا دارالحرب میں جمعہ کی نماز پڑھ لینے سے ظہر کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے؟ (۸)

۳- کیا بوقت ضرورت مسلمان غیر مسلموں سے سودی لین دین کر سکتے ہیں؟

ان سوالات کے جواب میں شاہ صاحب نے یہ اصولی بات بتائی کہ کسی ملک کے دارالحرب ہونے کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنا چاہیئے، اور دیکھنا چاہیئے کہ وہ صورتیں عیسائیوں کے مقبوضہ علاقوں میں پائی جاتی ہیں یا نہیں۔ اگر وہ صورتیں پائی جاتی ہیں تو پھر یہ علاقے دارالحرب ہوں گے۔ اور مسلمانوں اور حربیوں کے درمیان سودی لین دین از روئے شرع جائز ہوگا۔ بہرحال مسلمانوں کو یہ چاہیئے کہ وہ غیر مسلموں کو سود دینے میں احتیاط برتیں۔ اور بے ضرورت سود نہ دیں۔

اقامت جمعہ کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اگر کسی دارالحرب کے والی نے اپنی طرف سے کسی شہر میں مسلمان حاکم مقرر کر دیا ہے تو اس مسلمان حاکم کی اجازت سے جمعہ قائم کیا جائے گا۔ لیکن اگر ایسی صورت موجود نہ ہو تو پھر مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ باہمی مشورہ سے کسی امین او متدین شخص کو اپنا رئیس (امام) مقرر کر لیں اور اس کی اجازت سے شرعی امور مثلاً اقامت جمعہ و عیدین اور بے والی وارثوں وغیرہ کے نکاح کا انتظام کیا کریں۔ لیکن واضح رہے کہ یہ امام صرف شرعی معاملات پر نظر رکھے گا۔ ملک کی سیاسیات سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اگر یہ صورت بھی ممکن نہ ہو تو پھر مناسب یہ ہے کہ مسلمان جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد احتیاطاً چار رکعت نماز ظہر کی بھی پڑھ لیا کریں۔ تاکہ اگر جمعہ کی نماز سے فرضیت ادا نہیں ہوئی ہے تو پھر ان چاروں رکعت سے ظہر کی فرضیت ادا ہو جائے۔

سوال کی تیسری شق کے متعلق شاہ صاحب نے دارالحرب کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ سودی لین دین جائز ہے۔ (۹)

ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کے یہ جوابات آپ کے ہم عصروں کے علم میں ضرور آئے ہونگے۔ اور ان میں کچھ لوگ ایسے بھی رہے ہوں گے جنہیں یہ اندیشہ رہا ہوگا کہ اگر ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں باہمی سودی لین دین کی کھلی چھٹی دے دی گئی تو پھر

مسلمانوں میں سود کے خلاف تھوڑی بہت جو جھجک باقی رہ گئی ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ حسب ذیل سوال اسی فرضیت کی غمازی کرتا ہے۔ اگرچہ سوال کرنے والے کا نام نہیں معلوم۔ لیکن عبارت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سائل کی نظر مسائل فقہیہ پر اچھی خاصی ہے اور سوال کے پردہ میں وہ شاہ صاحب کے خیالات پر اعتراض کر رہا ہے۔ سوال یہ ہے:

"ہدایہ میں لکھا ہوا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے دارالحرب میں غیر مسلموں سے سود لینا جائز قرار دیا ہے۔ لیکن امام ابو یوسف، امام محمد اور امام شافعی اس رائے کے خلاف ہیں۔ قرآن و حدیث میں بھی سود کے بارے میں جو احکام مذکور ہیں ان کو دیکھتے ہوئے سود کا جواز (دارالحرب میں بھی) مستبعد العقل معلوم ہوتا ہے ——— اور ہاں کیا آپ انگریزوں کے علاقوں کو بھی دارالحرب سمجھتے ہیں؟" (۱۰)

اس سوال کے جواب میں بھی شاہ صاحب نے اپنے موقف میں تبدیلی نہیں کی۔ انہوں نے کہا کہ سود کے مسائل بہت پیچیدہ ہیں، مختصراً یہ سمجھنا چاہیئے کہ دارالحرب میں متامن مسلمان کے لئے یہ تو جائز نہیں ہے کہ وہ غیر مسلموں کے مال پر زبردستی قبضہ کرلے لیکن اگر کوئی غیر مسلم اپنی خوشی سے کچھ دے تو اس کا لینا جائز ہے۔ خواہ یہ ادائیگی کسی شرط فاسد ہی کے تحت کیوں نہ ہو رہی ہو۔ رہ گئی یہ بات کہ انگریزی علاقے دارالحرب ہیں یا نہیں اس کا پتہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لیجئے کہ حالات کی تبدیلی سے ایک دارالاسلام دارالحرب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تبدیلی لانے والے حالات کے تعین میں اختلاف رائے ہے۔ کچھ فقہا کا خیال ہے کہ شعائر اسلام میں سے اگر ایک شعار میں بھی تبدیلی آجائے تو دار کی حیثیت بدل جاتی ہے۔ مثلاً حکماً اذان اور نماز بند کر دی جائے یا ختنہ ممنوع قرار دے دیا جائے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ دار کی تبدیلی صرف شعائر اسلام کے محو ہو جانے پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ اگر تمام شعائر کی اجازت کے باوجود دارالاسلام میں شعائر کفر کھلم کھلا رواج پا جائیں اور مسلمانوں کو ان کے روکنے پر قدرت حاصل نہ ہو تو

پھر ایسا دارالاسلام دارالحرب ہو جاتا ہے، تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ دارالاسلام صرف اس وقت دارالحرب ہو جاتا ہے جب وہاں کوئی مسلمان یا ذمی امان اول پر باقی نہ رہ جائے، خواہ شعائر اسلام ترک ہوتے ہوں یا نہ ہوتے ہوں، اور خواہ شعائر کفر کا رواج ہوا ہو یا نہ ہو۔ اس تیسرے رائے کو محققین اور اہل علم صحیح سمجھتے ہیں۔ اور اس کے مطابق انگریزی علاقے بلاشبہ دارالحرب ہیں۔ (۱۲)

حاصل مدعا یہ ہے کہ شاہ صاحب کے مجموعہ فتاویٰ میں ہمیں جتنے بھی سوالات دارالحرب سے متعلق ملتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک سوال بھی یہ ظاہر نہیں کرتا کہ پوچھنے والے کو اس بات کی فکر تھی کہ اگر ہندوستان جو اس وقت تک کم از کم نظری طور پر دارالاسلام تھا۔ دارالحرب ہو گیا ہے تو پھر اسے سابقہ حالت پر لانے کے لئے مسلمانوں کو کیا کرنا ہوگا۔ اس کے برعکس ہر سوال اس وقت کے مسلمانوں کی معاشی اور سماجی حالت کی غمازی کرتا ہے۔ خواہ ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہو یا نہ ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ سودی لین دین اس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی میں گہری جڑ پکڑ چکا تھا۔ معاملہ صرف مسلمانوں اور غیر مسلموں تک محدود نہ تھا۔ بلکہ فتاویٰ عزیزی میں شاہ صاحب کا ایک ایسا بیان بھی ہمیں ملتا ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ خود مسلمان باہم ایک دوسرے سے سودی لین دین کرتے تھے۔ مندرجہ ذیل بیان جو کسی سوال کے جواب میں نہیں، بلکہ ایک مسئلہ کی حیثیت سے مجموعہ فتاویٰ میں مذکور ہے۔ اس معاملہ پر خاصی روشنی ڈالتا ہے۔ شاہ صاحب کے قول کے مطابق "احادیث کی رو سے سودی لین دین قطعاً حرام ہے، سوائے اس کے کہ کوئی چارہ کار باقی نہ رہ جائے،" ایسے مواقع پر قانون استثنیٰ پر عمل ہوگا، جیسا کہ قرآن نے اشد ضرورت کے موقع پر مردار کا کھا لینا بھی جائز قرار دیا ہے۔ لیکن اگر کسی جگہ سودی لین دین عام ہو جائے جس طرح کہ ہندوستان میں ہے، تو وہاں پر اس ناجائز کام کو قانون عموم بلویٰ (۱۳) کے تحت جائز قرار نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ عموم بلویٰ کا قانون طہارت و نجاست کے مسئلہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس قانون کی رو

سے حرام کو حلال یا حلال کو حرام نہیں قرار دیا جا سکتا۔ (۱۴)

مذکورہ بالا بیان میں اگرچہ یہ واضح طور سے نہیں کہا گیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں باہم سودی لین دین عام ہو گیا تھا۔ لیکن اگر ہم پچھلے فتووں کو ذہن میں رکھیں تو پھر اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ عبارت ایسے موقع کے لئے ہے جہاں دونوں پارٹیاں مسلمان ہیں۔ ورنہ جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں میں سودی لین دین کا مسئلہ تھا، اسے تو شاہ صاحب نے وضاحت کے ساتھ بتا دیا تھا کہ ہندوستان کے دار الحرب ہو جانے کے باعث اس میں کوئی قباحت نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن یہاں پر جو لوگ عموم بلوی کی آڑ لے کر سودی لین دین کو جائز قرار دینا چاہتے ہیں۔ شاہ صاحب اسے غلط قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عموم بلوی کی آڑ انہیں مسائل میں لی گئی ہو گی جہاں دونوں پارٹیاں مسلمان ہوں گی۔ یہ صرف ایک خیال ہی نہیں ہے کہ مسلمان باہم بھی سودی لین دین کرتے تھے۔ بلکہ ہمیں چند اور ایسے ہی سوالات مجموعہ فتاویٰ میں ملتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے بعض مسلمانوں کو یہ ڈر تھا کہ اگر دار الحرب کے مسئلہ کی بنا پر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں سودی لین دین کو جائز ٹھہرایا گیا تو ایک نہ ایک دن مسلمان خود ایک دوسرے سے کھلم کھلا سودی لین دین شروع کر دیں گے۔ ان خطوط پر سوچنے والے یہ چاہتے تھے کہ سود کو بالکلیہ حرام سمجھا جائے، لیکن شاہ صاحب نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر اس طرح اندیشۂ فردا کے تحت ہر مسئلہ کو حل کیا جائے گا تو پھر جہاد کو بھی ممنوع قرار دینا پڑے گا۔ کیوں کہ جہاد میں بظاہر تباہی و بربادی، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے علاوہ اور کیا ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ سب کچھ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہوتا ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں میں جنگ جوئی کی عادت باقی رہی تو اگر وہ کبھی غیر مسلموں کو نہ پائیں گے تو خود باہم ایک دوسرے سے جنگ و جدال شروع کر دیں گے۔ یہ کہنے کے بعد شاہ صاحب پوچھتے ہیں کہ کیا اس اندیشہ کی وجہ سے جہاد کو ناجائز قرار دے دیا جائے ؟ (۱۵)

اوپر کے صفحات میں دارالحرب میں سودی لین دین کے جواز کے سلسلے میں جو سوالات وجوابات پیش کئے گئے ہیں ان سے یہ مطلب نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ شاہ صاحب یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح سے سودی لین دین کو حرام کے درجہ سے نکال کر حلال قرار دے دیں۔ درحقیقت یہ مسئلہ جیساکہ اوپر ذکر ہوچکا ہے۔ اس زمانے کے حالات کی پیداوار تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط سے قبل جب تک مسلمانوں کی مضبوط حکومت قائم رہی اور کم از کم نظری طور حکومت یا اہلِ حکومت کا مذہب اسلام رہا۔ اس وقت تک عوام یہ سمجھتے رہے کہ ان کی معاشی ذمہ داریاں حکومت کے سر ہیں۔ مددِ معاش، جاگیرات اور اسی قسم کے دوسرے وظائف سے حکومت لوگوں کی مدد کرتی رہتی تھی۔ لیکن نظامِ حکومت کے بدل جانے کے بعد ہر شخص کی معاشی ذمہ داری اس کے اپنے سر آپڑی۔ خرچ کے سلسلے میں بگڑی ہوئی عادتوں کو سنبھالنا آسان نہ تھا۔ آسان صورت یہی رہ جاتی تھی کہ مستقبل کا خیال کئے بغیر حال کی ذمہ داریوں کو سودی قرض لے کر یا غیر مسلم حکومت سے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کر کے پوری کی جائیں۔ اور اس سلسلے میں شریعت کی طرف سے اگر کوئی رکاوٹ پڑتی ہو تو اسے شریعت کی روسے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ رویہ بظاہر خواہ کتنا ہی معیوب ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب کسی بھی مذہب کی شریعت ایک "قانون" کا درجہ حاصل کر لیتی ہے تو پھر ایک نہ ایک دن اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔ یہ رجحان ہمیں صرف ۱۹ ویں صدی کے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ماضی میں بھی نظر آتا ہے فقہ کی ہر اہم کتاب میں "حیلوں" کا ایک باب بھی ہوتا ہے۔ جن میں وہ صورتیں درج ہوتی ہیں جن پر عمل کر کے ایک شخص بظاہر شریعت کی روح کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی شریعت کی پابندی کرتا رہتا ہے۔ اس بات کو واضح کرنے کے لئے مجموعہ فتاویٰ عزیزی سے صرف ایک مثال پیش کرنی کافی ہوگی۔

ہنڈی یا آج کل کی اصطلاح میں بنک ڈرافٹ کے ذریعہ روپیہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا جو طریقہ ہے اس سے شاید ہی کوئی پڑھا لکھا شخص ناواقف ہو۔ شاہ صاحب سے

جب اس طریق کار کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے اسے ناجائز قرار دیا۔ کیوں کہ شریعت کی رو سے ہم جنس اشیاء کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ نہیں ہو سکتا لیکن اگر جنس بدل جائے تو پھر ہر قسم کی کمی بیشی جائز ہے۔ مثلاً ایک سیر چاول کے بدلے سوا سیر چاول نہ تولئے جا سکتے ہیں اور نہ دئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اسی ایک سیر چاول کا تبادلہ من دو من گیہوں سے ہو سکتا ہے کیوں کہ چاول اور گیہوں مختلف الجنس ہیں۔ اس طرح ایک جگہ زائد روپے دے کر دوسری جگہ کم روپے نہیں لئے جا سکتے۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص یا ادارہ ہنڈی کا کام کرتا ہے۔ وہ حق المحنت کے نام سے کچھ زیادہ روپیہ ادا کرتا ہے۔ زبان سے اس طریقہ کو ناجائز قرار دیدینا تو آسان ہے۔ لیکن عملی زندگی میں اس کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔ یا تو پوری قوم کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ گناہ کا ارتکاب کرتی رہے۔ یا پھر کوئی ایسی صورت نکالی جائے جس سے گناہ گناہ نہ رہے۔ اس نکتہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے شاہ صاحب نے ہنڈی کو جائز کر لینے کی ترکیب (" طریق حلال کردن این وبا ... ") بھی بتادی۔ آپ نے کہا کہ ہنڈی کی ممانعت صرف اس وجہ سے ہے کہ روپے کی جنس ایک ہے، اس لئے اس کے تبادلہ میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ لیکن روپوں کے ساتھ اگر کچھ ریزگاری بھی دی جائے اور اس کے بدلے صرف روپے لئے جائیں تو چوں کہ روپے اور ریزگاریاں مختلف الجنس ہیں اس لئے ان کے تبادلہ میں کمی بیشی جائز ہو جائیگی[۱۶]

یہ مثال جملہ معترضہ کے طور پر یہاں آگئی ہے اور اس کے بیان کرنے کا مقصد اگر ایک طرف یہ دکھانا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ۱۹ ویں صدی کی ابتدا میں ایک نئے نظام سے روشناس ہو رہے تھے اور ایک ایسی رہنمائی کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جو ان میں شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے نئے حالات سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کرے۔ تو دوسری طرف یہ سوالات ہمیں ان مسائل کے سمجھنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ جن سے اس وقت کے مسلمان دوچار ہو رہے تھے۔ سودی لین دین کے علاوہ دوسرے اہم مسائل جو اس وقت مسلمانوں کو درپیش تھے وہ بظاہر سیاسی لیکن درحقیقت معاشی تھے۔ قرآن کی آیت ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان (گناہوں اور برائیوں

میں تم شریک کار نہ ہو) کی موجودگی میں اکثر مسلمانوں کو ...... یہ خیال آتا رہا ہوگا کہ وہ انگریزوں سے تعاون نہ کریں کیوں کہ ان کی وجہ سے دارالاسلام کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ اگر وہ تعاون نہ کرتے تو کھاتے کہاں سے۔ کہنے کو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ زندہ رہنے کیلئے انگریزوں سے تعاون کرنا کچھ ضروری نہیں تھا کیوں کہ مسلمان آزادانہ طور سے صنعت و حرفت کے پیشے کو اختیار کر سکتے تھے۔ لیکن اس قسم کی بات درحقیقت وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے مسلم سماج کا گہرا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ مسلمانوں نے ہمیشہ ملازمت کو ذریعہ افتخار سمجھا ہے اور زراعت و تجارت وغیرہ کو دوسرے درجہ پر جگہ دی ہے۔ ۱۹ ویں صدی کی پہلی دہائی میں بھی یہی ذہنیت ہندوستانی مسلم سماج میں کارفرما تھی۔ ۱۲۲۹ھ یعنی ۱۸۱۳ء میں پوچھے گئے اس سوال کے جواب میں کہ حلال روزی کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے۔ شاہ صاحب نے ذرائع معاش کو چار درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں ملازمت سب سے اوپر ہے اس کے بعد زراعت پھر تجارت ہے۔ اور سب سے نیچے صنعت و حرفت ہے(۱۷) ظاہر ہے کہ جس سماج کے معاشی ڈھانچہ میں ملازمت اور زراعت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہو وہ سماج حکومت سے عدم تعاون کس طرح کر سکتا ہے۔ اس لئے شاہ صاحب کے سامنے جب بھی یہ سوال رکھا گیا کہ مسلمان انگریزوں کی ملازمت کریں یا نہ کریں؟ تو ہر بار آپ نے یہی کہا کہ انگریزوں کی ملازمت جائز ہے بشرطیکہ اس ملازمت میں خلاف شرع کوئی کام نہ کرنا پڑے(۱۸) ظاہر ہے کہ یہ شرط انگریزوں کے ساتھ مخصوص نہیں کی جا سکتی۔ کیوں کہ کسی بھی ملازمت میں اگر خلاف شرع کوئی کام کرنا پڑے تو وہ ملازمت جائز نہ ہوگی۔ خواہ ملازمت دینے والا مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ نہ صرف یہ کہ شاہ صاحب نے ملازمت کے جواز کا فتویٰ دیا بلکہ جب خود آپ کے بھتیجے اور داماد مولانا عبدالحی کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے میرٹھ کے مفتی کا عہدہ پیش کیا گیا تو شاہ صاحب نے انہیں ملازمت قبول کر لینے کی اجازت بھی دے دی۔ آپ کے اس فیصلہ کو اس وقت کے مشہور نقشبندی صوفی شاہ غلام علی نے پسند کیا اور شاہ عبدالعزیز کے نام ایک خط میں لکھا کہ انگریزوں کی ملازمت سے رزق حاصل کرنے

کی بجائے مولانا عبدالحی کو چاہیئے کہ وہ فقروفاقہ کی زندگی اختیار کریں۔ لیکن شاہ صاحب نے اس خط کے جواب میں اپنے خیالات کو بہت ہی تفصیل سے پیش کرتے ہوئے اپنے اور مولانا عبدالحی کے طرزِ عمل کو شریعت کی نظروں میں بہتر اور پسندیدہ ثابت کیا۔ (۱۹)

ملازمت پیشہ مسلمانوں کے برخلاف زراعت پیشہ مسلمان دہری مشکلات سے دوچار تھے انگریزوں کے اقتدار کے بعد زراعت کے لئے زمینیں انگریزوں ہی کے ذریعہ مل سکتی تھیں۔ اور یہ زمینیں وہی تھیں جو انگریزوں نے مسلمان بادشاہ یا مسلمان زمین داروں سے چھینی تھیں۔ اب اگر ان چھینی ہوئی زمینوں کو مسلمان انگریزوں سے لے کر کاشت کرتے تو سب سے پہلے انہیں یہ اطمینان دلانے کی ضرورت تھی کہ ان کا یہ فعل "تعاون علی الاثم والعدوان" کے زمرہ میں نہیں آتا اور دوسری طرف اس خدشہ کو بھی دور کرنا تھا کہ اب جن (انگریز) بادشاہوں سے وہ زمین حاصل کر رہے ہیں دارالاسلام پر ان کا قبضہ شرعاً تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کیوں کہ ان کا قبضہ اگر عندالشرع نہ ہو تو اس بات کا پورا امکان تھا کہ انگریزوں کے کسی وقت بھی ملک سے چلے جانے کے بعد سابقہ مالکان از روئے شرع زمینوں کے دعویدار ہو جائیں گے۔ اس اندیشہ کی وجہ یہ تھی کہ بعض فقہا کے خیال میں دارالاسلام ہمیشہ دارالاسلام ہی رہتا ہے اور اگر کبھی اس پر حربیوں کا قبضہ ہو بھی جائے تو اس کیفیت کو عارضی سمجھا جائے گا۔ اگر اس فتویٰ پر عمل کیا جاتا تو پھر ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ اور ان سے کئے ہوئے ہر قسم کے معاہدات از روئے شرع عارضی ہوتے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ ایک زراعت پیشہ شخص انگریزوں سے حاصل کی ہوئی زمین پر محنت اور سرمایہ لگانے سے ہچکچاتا، کیوں کہ اس کو اپنی ملکیت کا اطمینان نہ ہوتا۔ شاہ صاحب نے زمینوں کے مسئلہ کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھا۔ اسی لئے جب ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ خیال بے بنیاد ہے کہ ایک دارالاسلام دارالحرب نہیں ہو سکتا۔ یہ تبدیلی ممکن ہے، کیونکہ جب کبھی بھی حربی کسی دارالاسلام ... پر اس طرح قابض ہو جائیں کہ مسلمان اپنی سیاسی قوت کھو دیں، تو وہ ملک دارالحرب ہو جاتا ہے۔ شریعت حربیوں کے قبضہ کو تسلیم کر لیتی ہے۔ اور انہیں یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی

رعایا سے جس قسم کے معاہدات چاہیں کریں۔ اس نظریہ کے مطابق ہندوستان کی آراضیات پر انگریزوں کا قبضہ عارضی نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے جو لوگ ہندوستانیوں کی ضبط شدہ آراضیات انگریزوں سے قیمتاً یا تحفتاً قبول کر کے اپنے تصرف میں لائیں گے۔ وہی لوگ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی شرعاً مالک شمار ہوں گے۔ پرانے مالکان ان زمینوں کو واپس لینے کے مجاز نہ ہوں گے۔ (۲۰)

یہ صحیح ہے کہ مجموعہ فتاویٰ میں ایسا کوئی سوال ہمیں نہیں ملتا جس میں یہ پوچھا گیا ہو کہ ہندوستان کے دار الحرب ہو جانے کے بعد مسلمانوں پر ہجرت یا جہاد کا فریضہ عائد ہوتا ہے یا نہیں لیکن ہمیں ایسے اشارات ضرور ملتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ بات آ رہی تھی کہ ہندوستان کے دار الحرب ہو جانے کے بعد وہاں سے ہجرت کر جانا ضروری تھا۔ ہمیں اسکی شہادت تو نہیں ملتی کہ شاہ صاحب کی زندگی میں کسی بھی عالم نے ہجرت کے مسئلہ پر عمل کرتے ہوئے اجتماعی ہجرت کی کوئی تحریک چلائی ہو۔ لیکن مجموعہ فتاویٰ عزیزی میں ہمیں کسی شخص کا ایک اعتراض شاہ صاحب کے اس طرزِ عمل پر ملتا ہے کہ وہ ہندوستان کو دار الحرب سمجھتے ہوئے بھی وہاں قیام پذیر تھے۔ یہ طرزِ عمل معترض کی نظروں میں خلاف شریعت تھا۔ شاہ صاحب نے اس اعتراض کو صحیح تسلیم نہیں کیا۔ آپ کے خیال میں اس دار الحرب سے ہجرت فرض تھی۔ جہاں مسلمانوں کو اپنے شعائر دینی ادا کرنے کی ممانعت ہو۔ ہندوستان میں مسلمان چوں کہ اپنے شعائر دینی مثلاً اذان، نماز قربانی وغیرہ کی ادائیگی میں آزاد تھے۔ اس لئے ہندوستان دار الحرب ہوتے ہوئے بھی اس زمرہ میں نہیں آتا تھا جہاں سے ہجرت کرنی ضروری ہوتی۔ (۲۱) یہاں یہ بات ضرور ذہن میں رہنی چاہیے کہ شاہ صاحب دار الحرب سے ہجرت اس وقت تک ضروری قرار نہیں دیتے جب تک کہ شعائر مذہبی کو ادا کرنا حکومت کی طرف سے باقاعدہ ممنوع قرار نہ دے دیا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ "ممانعت" کا عدم "قدرت" کے مترادف نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی حکومت اپنی بے تعصبی اور سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر مسلمانوں کے شعائر دینی میں دخل اندازی نہ کرے۔ لیکن اگر مسلمانوں میں سیاسی قوت نہیں ہے

تو پھر ان شعائر پر عمل در آمد "مرحمت خسروانہ" ہے "ہمت مرداں" نہیں۔ اس نقطہ نظر سے ہندوستان دار الحرب نہیں تھا۔ کیوں کہ انگریزوں کی بے تعصبی یا ان کی اپنی سیاسی مصلحتوں کے باعث مسلمان اپنے روز مرہ کے فرائض ادا کرنے میں بالکل آزاد تھے۔ اس لئے فریضہ ہجرت کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اگر دار الحرب کی ہمیشہ یہی تعریف کی جاتی تو پھر اسی زمانہ میں سودی لین دین یا اسی قسم کے دوسرے مسائل معاشیات پر بھی نظر ثانی کرنی پڑتی کیونکہ جب ہندوستان دار الحرب تھا ہی نہیں، تو پھر سودی لین دین کا جواز کہاں سے پیدا ہوتا۔ غالباً اسی دشواری کو کو دور کرنے لئے شاہ صاحب نے جہاں پر انگریزوں کی دی ہوئی زمینوں اور دوسرے عطیات کو قبول کرنے کی بحث کی ہے وہاں پر آپ نے "سیاسی قوت" کی شرط کو نظر انداز کر دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اگر کسی ملک میں مسلمان اپنی سیاسی قوت کی بناء پر نہیں بلکہ حکومت کی بے تعصبی کی وجہ سے شعائر دینی ادا کرتے ہوں تو ایسے ملک کو دار الحرب کہا جائے گا۔ اور وہاں غیر مسلموں سے سودی لین دین جائز ہوگا۔ نیز غیر مسلم حکومت کی عطا کردہ زمینوں پر حق ملکیت باقی رکھنے کا حق بھی ہوگا۔ (۲۲)

رہ گئی جہاد کی بات تو مجموعہ فتاویٰ میں ہمیں اس موضوع پر کوئی سوال نہیں ملتا۔ نہ تو اس سلسلے میں کسی نے آپ سے فتویٰ طلب کیا، نہ کسی نے آپ پر اعتراض کیا کہ ہندوستان کو دار الحرب سمجھنے کے بعد آپ جہاد کیوں نہیں کرتے۔ ہاں ایک موقع پر قرآنی آیت "وجاھدوا فی سبیل اللہ" کی تشریح کرتے ہوئے شاہ صاحب نے جہاد کی جو تعریف کی ہے وہ بعینہ وہی ہے جسے ختم ۱۹ ویں صدی میں سرسید، امیر علی، اور چراغ علی وغیرہ نے اختیار کیا تھا۔ شاہ صاحب کے خیال میں "جہاد کی تین قسمیں ہیں۔ قسم اول جہاد زبانی ہے۔ اس جہاد کو وعظ و نصیحت، ترغیب و ترہیب اور رفع شبہات مخالفین کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے۔ دوسرے نمبر پر وہ جہاد ہے جس میں مسلمان اس خیال سے جنگی تیاری کرتے ہیں کہ اگر حقیقتاً جنگ کا موقع آگیا تو پھر انہیں شکست نہ ہو۔ تیسرے نمبر پر وہ جہاد ہے جس میں باقاعدہ دست بدست جنگ

ہوتی ہے۔ جہاد کی ان تینوں قسموں پر تفصیلی روشنی ڈالنے کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ " بلاشبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلی دو قسموں کے جہاد میں مشغول تھے۔ قسم سوم میں جو درحقیقت سب سے ادنی جہاد ہے، آں حضرت نے شرکت نہیں کی۔" (۲۳)

مذکورہ بالا بحث کے بعد ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ کم از کم شاہ صاحب یا ان کے ہم عصر مسلمان، دارالحرب کے مسئلہ کو اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھ رہے تھے، جس نقطہ نظر سے ہم چاہتے ہیں کہ وہ دیکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی بدلتی ہوئی صورت حال نے اس وقت کے مسلمانوں کے سامنے چند اہم معاشی مسائل لا کھڑے کئے تھے۔ اور وہ ان مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے بے چین تھے۔ دارالحرب اور دارالاسلام کی بحث میں ایک موقف تو وہ تھا جسے شاہ صاحب نے اختیار کیا۔ اور دوسرا موقف یہ ہو سکتا تھا کہ آپ ہر سوال کرنے والے کو یہ جواب دیتے کہ ہاں ہندوستان دارالحرب تو ہو گیا ہے لیکن تم سود کا جواز معلوم کرنے کے بجائے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ ہندوستان کو پھر سے دارالاسلام کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب یہ جواب دے سکتے تھے لیکن اگر وہ ایسا کرتے تو درحقیقت ماہر قانون شریعت (مفتی) کے موقف سے ہٹ چکے ہوتے کیوں کہ قانون شریعت کے ماہر ہونے کے باعث اگر ایک طرف ان کا یہ فریضہ تھا کہ وہ شریعت کی حد میں رہتے ہوئے مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کریں تو دوسری طرف تاریخ دین پر گہری نظر ہونے کی وجہ سے انہیں اپنے جوابات سے مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات بھی بٹھانی تھی کہ قانون شریعت جامد نہیں، بلکہ لچکدار اور زمان و مکان کا پابند ہے۔ اس لئے ان قوانین پر زمان و مکان کی تبدیلیوں کا اثر بھی ناگزیر ہے۔

حوالجات

۱۔ اس فرق کی ایک بہترین مثال ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد کے جاری کردہ فتاویٰ ہجرت میں نظر آتی ہے جسے انہوں نے کسی استفتا کے بغیر ۱۹۲۰ء میں دیا تھا۔ اس فتویٰ میں مولانا آزاد

نے مسلمانوں پر ہندوستان سے ہجرت ضروری قرار دی تھی۔ چوں کہ مولانا نے وہ فتویٰ کسی شخص کے سوال کے جواب میں نہیں دیا تھا اس لئے ہم اس فتویٰ کے ظاہری یا معنوی معنی نکالنے میں آزاد ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ہجرت کرنے کا کوئی خیال نہیں تھا لیکن چوں کہ مولانا اس وقت کی سیاسی صورت حال کے پیش نظر ہندوستان سے ہجرت ضروری سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے ایمان داری کے ساتھ اپنی رائے عوام کے سامنے پیش کردی تھی لیکن اگر یہی فتویٰ کسی شخص کے استفتا کے جواب میں ہوتا تو پھر یہ کہا جاتا کہ اس زمانے میں مولانا آزاد کے علاوہ بھی کچھ ایسے لوگ موجود تھے جن کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ آیا ہندوستان سے ہجرت کر جانی چاہئے یا نہیں۔ (مولانا آزاد کے فتوائے ہجرت کے متن کے لئے ملاحظہ ہو" تبرکات آزاد" مرتبہ غلام رسول مہر، کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۹، صفحات ۲۰۳ مسلسل اس سے قبل یہ فتویٰ ہفت روزہ اہل حدیث امرت سر کی اشاعت ۳۰ جولائی ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔)

۲۔ ابتدائی ۱۴ویں صدی ہجری (آخر ۱۹ویں صدی عیسوی) میں مطبع مجتبائی دہلی کے مالک مولوی عبدالاحد کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاہ صاحب کے جتنے بھی فتاویٰ دستیاب ہوسکیں، اُنہیں ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کردیا جائے۔ انہوں نے تمام فتاویٰ کو جمع کرایا اور اپنے زمانہ کے مشہور علماء کی تصحیح کے بعد انہیں دو جلدوں میں اپنے ہی مطبع سے مجموعہ فتاویٰ عزیزی (فارسی) کے نام سے شائع کردیا۔ پہلی جلد ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۳ء) اور دوسری جلد ۱۳۱۴ھ (۱۸۹۶ء) میں شائع ہوئی۔ ان دونوں جلدوں میں شاہ صاحب کی ہر وہ تحریر جو مرتبین کی نظروں میں "فتویٰ" معلوم ہوئی جمع کردی گئی۔ مثلاً انہیں صفحات میں شاہ صاحب کے بیان کردہ بہت سارے تفسیری نکات اور چند ایک ایسے خطوط بھی ملتے ہیں، جو انہوں نے اپنے دوستوں، شاگردوں اور ہم عصروں کو کسی علمی مسئلے پر لکھے تھے دونوں جلدوں کے شروع میں ایک مجمل سی فہرست مضامین بھی ہے لیکن درحقیقت کتاب کی ترتیب میں کسی قسم کا بھی اصول پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے۔ اس فارسی کتاب کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اور بازار میں دستیاب ہے۔

۳۔ "امان اول" سے وہ معاہدات مراد ہیں جو دارالاسلام اور اس کے مسلمان اور غیر مسلم شہریوں کے درمیان ہوتے ہیں۔

۴۔ مضمون نگار نے اپنی سی پوری کوشش کی لیکن اسے ان دونوں شخصیتوں کے حالات کہیں دستیاب نہ ہوسکے۔

۵۔ ملاحظہ ہو مجموعہ فتاویٰ عزیزی (آئندہ صرف فتاویٰ لکھا جائے گا) از شاہ عبدالعزیز دھلویؒ (فارسی) جلد اول ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۳ء) صفحات ۱۷، ۱۸۔

۶۔ ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۱۲

۷۔ فتاویٰ جلد ۱، ص ۲۸۔

۸۔ بظاہر سائل ظہر کی فرضیت کے بارے میں سوال کر رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے سوال کا پس منظر یہ ہے کہ جمعہ کی امامت اصلاً خلیفہ کی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ خود امامت نہ کر سکے اور ظاہر ہے کہ وہ بیک وقت مختلف جگہوں پر امامت نہیں کر سکتا۔ تو پھر اس کا مقرر کردہ امام اس فرض کو ادا کرے گا۔ دارالحرب میں چونکہ خلیفہ عزل و نصب کا اختیار نہیں رکھتا اس لئے امام جامع مسجد بھی درحقیقت خلیفہ کی نیابت نہیں کرتا، اس دشواری کی وجہ سے اکثر فقہاء کے نزدیک دارالحرب میں جمعہ کی نماز ادا نہیں کی جائے گی۔ بلکہ عام دنوں کی طرح ظہر کی نماز پڑھی جائے گی۔ اب اگر اس کے باوجود کسی دارالحرب میں مسلمان جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں، جو بظاہر ان پر فرض نہیں ہے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ آیا وہ پھر سے ظہر کی نماز پڑھیں یا جمعہ ہی کی نماز کو کافی سمجھیں۔ اگر دیکھا جائے تو اس سوال میں بھی وہی حصول حق کی ذہنیت کام کر رہی ہے۔ ظہر کی نماز کے مقابلہ میں جمعہ کی نماز زیادہ اہتمام چاہتی ہے۔ ظہر کی جماعت اگر چھوٹ جائے تو آدمی اسے تنہا بھی پڑھ سکتا ہے۔ لیکن جمعہ کی جماعت اگر ایک مسجد میں نہ ملے تو دوسری کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ جمعہ کی نماز میں جماعت اور خطبہ چھوٹ جانے کے ڈر سے وقت سے بہت پہلے مسجد میں آکر بیٹھنا پڑتا ہے، لیکن اگر جمعہ کی فرضیت ختم ہو جاتی ہے تو دکان اور کاروبار کو بند کر کے جامع مسجد میں آنے کی چھٹی

مل جاتی ہے۔ اور اپنے پڑوس کی مسجد یا گھر یا دکان ہی پر ظہر کا فریضہ ادا کیا جاسکتا ہے۔

۹۔ فتاویٰ جلد ۱، صفحات ۳۳، ۳۴

۱۰۔ ″ ص 115

۱۱ تشریح کے لئے ملاحظہ ہو گزشتہ حاشیہ نمبر ۳

۱۲۔ فتاویٰ جلد ۱، صفحات ۱۱۵، ۱۱۶ (مضمون نگار کا خیال ہے کہ اس سے قبل متن حاشیہ نمبر ۶ کی جس عبارت کے بارے میں یہ شبہ ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ کسی دوسری جگہ سے تعلق رکھتا ہے وہ ٹکڑا اس فتویٰ کا ایک حصہ ہے۔ اس سوال میں خاص طور سے انگریزی علاقوں کے بارے میں پوچھا گیا ہے اور شاہ صاحب نے ان علاقوں کو "امان اول" کے معدوم ہو جانے کے باعث دارالحرب قرار دیا ہے۔ اگر "اس شہر دہلی میں ..." والا ٹکڑا ہم اس جواب کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو یہ معلوم ہوگا کہ دہلی سے لے کر کلکتہ تک کے سیاسی حالات کا تجزیہ دراصل "امان اول" کی عدمیت کی تفصیل میں ہے۔

۱۳۔ عموم بلویٰ اس مرگ انبوہ کو کہتے ہیں۔ جس سے ایک بہت بڑا گروہ مستقل طور سے دو چار رہتا ہو، مثلاً نماز پڑھنے کے لئے کپڑوں کا پاک ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ شبہ ہو جائے کہ کپڑے پر نجاست لگ گئی ہے تو اسے صاف کرنا ضروری ہوگا۔ لیکن ایسے لوگ جن کا کاروبار ہی اس قسم کا ہو کہ انہیں ہر وقت گوبر اور غلاظت سے واسطہ پڑتا ہو تو ان کے لئے یہ اجازت ہے کہ وہ جب تک اپنے کپڑوں پر نجاست نہ دیکھ لیں اس وقت تک اپنے کپڑوں کو صاف سمجھیں۔

۱۴۔ فتاویٰ جلد ۱، ص 129

۱۵۔ ″ ص 116

۱۶۔ ″ ص ۳۲ اس مثال سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ شاہ صاحب ایک حرام شئے کو جانتے بوجھتے حلال ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کیوں کہ اس قسم کی کوشش شاہ صاحب کے نزدیک صریحاً کفر ہے اور ایسا شخص جو محض اتباعِ نفس کی خاطر حلال کو حرام یا

حرام کو حلال سمجھتا ہو کافر ہے" (ملاحظہ ہو فتاویٰ جلد ۱، ص ۱۵۶) درحقیقت شاہ صاحب نے ہنڈی کے مسئلہ میں جو رائے دی ہے۔ وہ اس سماج کے طریق فکر کی عکاسی کر رہی ہے جہاں شریعت اور قانون میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ دائرہ قانون میں رہتے ہوئے قانونی شکنجوں سے چھٹکارہ پانے کی کوشش انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔

۱۷۔ شاہ عبدالعزیز، مجموعہ رسائل خمسہ (مجموعہ فتاویٰ عزیزی جلد اول کے ساتھ مطبوعہ) صفحہ ۱۸۵۔

۱۸۔ فتاویٰ جلد ۱، صفحات ۱۱۴، ۱۹۵، ۱۹۶، جلد ۲ ص ۱۱۹

۱۹۔ فتاویٰ جلد ۱، ص ۹۱۔

۲۰ ایضاً جلد ۱، صفحات ۱۶۲، ۱۶۳

۲۱ ایضاً جلد ۱ ص ۵۲

۲۲۔ ایضاً جلد ۱ ص ۱۶۳

۲۳۔ فتاویٰ جلد دوم ص ۸۸

تاریخی مقالات

پیش نظر مجموعہ پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی اُستاذ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اُن مقالات پر مشتمل ہے جو گذشتہ ۱۸، ۱۹ سال میں موصوف نے وقتاً فوقتاً لکھے ہیں، اب نظر ثانی کے بعد ان مقالات کو کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے۔ حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبہ (خطبۃ الوداع) کے علاوہ دوسرے تمام مقالات ہندی قرونِ وسطیٰ کے سماجی حالات یا ادبی اور مذہبی تحریکات سے متعلق ہیں جن کا مطالعہ بہت ہی معلومات افزا ہے۔ طباعت کتابت دیدہ زیب کاغذ عمدہ گلیز۔ سائز متوسط ۲۶×۲۰/۸ صفحات ۳۰۸ ــــ قیمت: سات روپے، مجلد آٹھ روپے

منیجر ندوۃ المصنفین دہلی ۶